بلند اقبال اور ''فرشتے کے آنسو''

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ

ڈاکٹر بلند اقبال اردو فکشن میں ابھرتا ہوا نیا نام ہے، جن کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں نے پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ بنالیا ہے۔ موصوف پیشے سے فزیشین ہیں۔ ایک علمی اور ادبی گھرانے سے ان کا تعلق ہے۔ پاکستان کے مشہور شاعر حمایت علی شاعر کے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے کراچی کے داؤد میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس اور امریکہ سے انٹرنل میڈیسن میں ایم بی آئی ایم کی سند حاصل کی اور ان دنوں کنیڈا میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ضامن جعفری نے بجا فرمایا ہے کہ:

''بلند اقبال انسانوں اور معاشرتی اقدار دونوں کے معالج ہیں۔ طبابت ان کا پیشہ ہے اور قلم ان کا تیشہ''۔

لہٰذا ایک طبیب اور ادیب ہونے کے ناطے وہ صحت مند معاشرہ کے لئے جسمانی، ذہنی اور تخلیقی نشو ونما پر زور دیتے ہوئے ان عوامل کی نشاندہی کرتے ہیں جو انفرادی اور سماجی ارتقا کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوی موضوعات میں کہیں کہیں ایک خاص نوع کی بے رحمی پائی جاتی ہے لیکن اس بے رحمی میں نشتر لگانے والے ڈاکٹر جیسی ہمدردی موجود ہے۔

اس وقت میرے پیش نظر ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''فرشتے کے آنسو'' ہے جس میں مختلف النوع موضوعات پر ۳۶ مختصر افسانے بعنوان ''یا بی بی سیدہ''، ''شکوہ''، ''فرشتے کے آنسو''، ''نہیں''، ''کارٹون''، ''سہاگ رات''، ''یہ کیسی بے وفائی ہے''، ''بے زمینی نسل کشی ہے''، ''ادھورا کافر''، ''فورتھ ڈائمنشن''، ''خدا کا بت''، ''اکیسویں صدی کی موت''، ''بیوی دوسرے کی''، ''بے وفائی''، ''انتظار''، ''لال چونا''، ''نروان''، ''AllegiancePledge of''، ''بے بی کیئر سنٹر''، ''بنا پیندے کے لوٹے''، ''اندھا فرشتہ''، ''میوٹیشن''، ''گدھ''، ''آوارہ خیال''، ''پردے جو نفرتوں کے تھے''، ''بھینٹ''، ''ستیہ کے بکھرے ہوئے بال''، ''آدھا مرد''، ''ایمپٹی نیسٹ سنڈروم''، ''لفظ... جو طوائف بن گئے''، ''شرک''، ''اپوپٹوسس''، ''پراسرار مسکراہٹ''، ''ٹیڈی بیئر''، ''پہلا پیار'' اور ''تمنا'' شامل ہیں۔ ان افسانوں میں موضوعی تنوع کے ساتھ ندرت بھی ہے۔ بعض موضوعات تو ایسے ہیں جن سے عام قاری پہلی بار متعارف ہوگا۔ افسانہ نگار کی فکر بلند اور شعور پختہ ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص اسلوب میں جو بیانیہ خلق کیا ہے اس سے ان کی ہنر مندی کا پتہ ملتا ہے۔ ان کے اکثر افسانے فکر وفن کے اعتبار سے لائق توجہ ہیں۔ ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانوں میں ہمارے معاشرے کے چبھتے ہوئے پُر فکر مسائل سے مکالمہ ہوتا ہے جو لمحے بھر میں قاری کو سوچ کی نت نئی جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔ گویا ان کی بصارت فکر کے انگنت دریچے کھول دیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ کہانی کیوں لکھتے ہیں؟ اس کا مقصد کیا ہے؟

بلند اقبال ایک حقیقت پسندانہ وژن کے مالک ہیں۔ کہانیاں ان کے نزدیک ذہنی عیاشی نہیں بلکہ خوشنما رنگوں والی نیم آوارہ تتلیوں کی طرح ہیں جنہیں وہ گرفت میں لینا چاہتے ہیں لیکن کہانیوں کو جھلسا دینے والی آگ سے بھی تعبیر کرتے ہیں جو معنوی دھواں بھی پیدا کرتی ہے اور سوچ کے تمام بند دریچوں کو خاکستر کر کے اس میں پھر سے نئے رنگ بھرتی ہے۔ وہ ''کہانیاں اور میں'' میں لکھتے ہیں:

> ''کہانیاں.... جھلسا دینے والی آگ کی طرح ہوتی ہیں جو لفظوں کے دہکتے کوئلوں سے معنوں کا وہ دھواں پیدا کرتی ہیں جو سوچ کے تمام بند دریچوں کو راکھ کر دیتا ہے اور پھر نئے شگوفے کھلاتی ہیں، شبنمی قطروں سے، پتیوں کے رنگوں سے پھولوں کو نکھار دیتی ہیں اور خوشنما رنگوں والی نیم آوارہ تتلیوں کو پھر سے ان میں بسا دیتی ہیں..... کبھی انساں تو کبھی خدا بنا دیتی ہیں۔
>
> کہانیاں..... انسانوں کی طرح تہہ در تہہ ہوتی ہیں۔ کبھی ہوا کے تند جھونکوں سے ان کی شوخی کے سارے رنگ اڑ جاتے ہیں اور بچ جاتا ہے محض ایک مادر زاد برہنہ سچ، جو خزاں رسیدہ پتیوں سے اپنے بدن کو بچانے کے بجائے تیز وتند جھونکوں سے تنہا ہی الجھ جاتا ہے۔
>
> میں بھی کچھ ایسی ہی کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں جو تتلیوں کی طرح سندر ہوں اور آگ کی طرح جھلسا دینے والی بھی، جو ناگن کی طرح ڈسنے والی ہوں تو منکہ کی طرح زہر چوسنے والی بھی۔
>
> پچھلے چار پانچ برسوں سے میں کسی ایسی ہی سچی کہانی کی تلاش میں اپنی ذات کے اندر اترا ہوا ہوں''۔

(''فرشتے کے آنسو''، ص:۹-۱۰)

بلند اقبال کو جو چند سچی اور اچھی کہانیاں میسر آ گئی ہیں تو وہ دراصل ان کے اسی تلاش و جستجو کا ثمرہ ہیں۔ آیئے اب ان کی چند کہانیوں کے موضوعات پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے ان کے فنی و فکری امتیازات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس مجموعے کی پہلی کہانی ''یا بی بی سیدہ'' نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ آبدیدہ بھی۔ اس کہانی کا مرکزی خیال اولاد کی ذہنی نشو ونما اور شخصیت کی تعمیر سازی میں ماں کی محبت اور ہدایت کی اہمیت پر اصرار کرتا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہی اسباب اولاد کو والدین کی کمی کا ہمیشہ احساس دلاتے رہتے ہیں۔

یہ ایک شخص کی یادداشت پر مبنی وہ بیانیہ ہے جس میں کہانی کا مرکزی کردار اپنے ذہن کے آئینہ خانے میں اپنی ماں کی محبت، شفقت اور ہدایت کی جھلک بار بار دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ علم و کمال کے جو دروازے اس کے ذہن پر وا ہوئے ہیں، وہ اس کی ماں کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں تھا اور یہی سبب ہے کہ اپنی ماں کے دنیا سے گزر جانے کے بعد وہ اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کرتا ہے:

''میری عادت تھی کہ میں اکثر اپنی اہم چیزیں بھی رکھ کر بھول جاتا تھا اور پھر پاگلوں کی طرح سارا گھر سر پر اٹھا لیتا تھا۔ امی جب بھی مجھے اس حال میں دیکھتیں تو کہتیں... ''بیٹے دل میں کہو... حضرت بی بی سیدہ، سلام کروں گا چودہ، میری کھوئی ہوئی چیز کر دو پیدا''۔ ''جب سے امی کھو گئی ہیں... میں نے ہر لمحے بی بی سیدہ سے یہی دعاء کی ہے''۔

(افسانہ ''یا بی بی سیدہ''، ص:۱۴)

اس کہانی کا مرکزی کردار خود مصنف کی ذات ہے۔

''شکوہ'' بھی ایک موثر کہانی ہے۔ اس کا مرکزی خیال عنوان کی مناسبت سے اس شکایت سے مملو ہے جو عصر حاضر کا انسان اپنی زندگی کی کربناکیوں اور المناکیوں سے تنگ آ کر اپنے خالق حقیقی سے کرتا ہے اور اس سے اپنی تخلیق کا مقصد جاننا چاہتا ہے۔

یہ ایک ایسے آرٹسٹ کی کہانی ہے جس کے ذریعہ کینوس پر بنائے گئے چہرے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے سوال اٹھاتے ہیں کہ آخر اس نے انہیں بازار کی جنس کیوں بنا دیا ہے؟ کیا وہ محض بازار میں بکنے والی ایک شئے ہے؟ مصور بھی یہ سن کر انتہائی غمگین ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس نے یہ تخلیق کیا صرف اسے فروخت کرنے کی خاطر کی تھی۔ وہ اپنے داخل میں اتر کر خود احتسابی سے گزرتا ہے اور پھر اپنے کرب کو خدا سے مکالمہ کرتے ہوئے یوں بیان کرتا ہے:

''میری تخلیق تو آرٹ گیلری میں محض ایک بار بکتی ہے اور تمہاری تخلیق یہاں دنیا میں بار بار...''۔

گویا مصور کو یہ خیال آتا ہے کہ انسان کی زندگی بھی تو آج ایک اشیائے خرید و فروخت بن کر رہ گئی ہے اور اس کی ذہنی و باطنی کرید یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ شاید اس کے خالق کا مقصد بھی یہی ہے۔

یہ کہانی دراصل آج کے مارکیٹ کلچر کا نوحہ پیش کرتی ہے، جس نے ہر شئے کو خرید و فروخت کی جنس بنا کر رکھ دیا ہے۔ دیکھا جائے تو اس کہانی میں احتجاج بھی ہے، استفسار بھی اور انسانی کمزوریوں کی نشاندہی بھی۔

''فرشتے کے آنسو'' کائنات کی بساط پر انسان کی بے بسی کی ایک ایسی داستان ہے جسے افسانہ نگار نے علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔

فرشتہ جسے انسانی اعمال لکھنے کے لئے خدا کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے، ایک بے بس کوما کی حالت میں پڑی ہوئی بیمار لڑکی کی تقدیر لکھتے لکھتے ایک دن جب اس لڑکی کی بے چارگی اور بے بسی کو محسوس کرتا ہے تو خود بھی رو پڑتا ہے۔ لڑکی کی ماں جو اس بستر سے لگی لڑکی کی خدمت پر مامور تھی، ۲۱ برسوں تک مسلسل اس کی خدمت کرتے کرتے اور دوبار اس کی صحت کی امید دل میں لے کر آخر ایک دن اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے اور اپنی ماں کی خدمت اور محبت سے محروم وہ لڑکی مکڑی کے جال میں پھنسی ہوئی کسی مکھی کی طرح دھیرے دھیرے اپنی موت کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے:

''فرشتے نے لرزتے ہاتھوں سے دوبارہ قلم اٹھایا اور لکھنے کی کوشش کی مگر اسے لگا جیسے اس کا بنایا ہوا ہر لفظ اس کے آنسوؤں میں بھیگ کر اس کے روتے ہوئے دل کی تصویر بنتا جا رہا ہے۔ آہ..... کیا فرشتے رو نہیں سکتے..... اس نے خداوند تعالیٰ کے آگے سرنگوں کیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا''۔ (افسانہ ''فرشتے کے آنسو''، ص:۲۰)

گویا اب فرشتے بھی انسان کے درد کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے آنسو بہانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس کہانی پر اظہار خیال کرتے ہوئے افسانہ نگار انیس رفیع نے درست لکھا ہے:

''یہاں تین Characters ہیں۔ یہ تینوں صالح اور نیک قدروں کے حامل ہیں۔ جال میں پھنسی ہوئی مکڑی لڑکی کی اس شدید کشمکش جو زندگی اور موت کے بیچ ہوتی ہے کا معروضی اشارہ ہے اور افسانے میں تکنیکی Variety (ورائٹی) کا باعث بھی مگر فکری کردار میں متبدل نہیں ہو پاتی۔ بقیہ تینوں کردار افسانے کو ارتقائی مرحلوں سے گزار کر ایک Melodramatic موڑ پہ ختم کرتے ہیں۔ کیا فرشتے رو نہیں سکتے! اور یہ جملہ اس معصوم لڑکی جس کا جسم ۲۱ برس کا بے حس و حرکت مردے جیسا پڑا ہے،

کے دل کی فریاد ہے۔ زندگی نے اسے زندگی کا حق نہیں دیا تو کیا وہ فریاد کے حق سے بھی گئی۔ افسانہ قدرت کی نامہربانیوں کی تمثیل ہے''۔ (مضمون ''بلند اقبال کے افسانے بحوالہ فرشتے کے آنسو''، ''تحریک ادب''، بنارس، کتابی سلسلہ نمبر ۴)

''نہیں'' بھی ایک قابل توجہ کہانی ہے۔ ازدواجی زندگی کے اندرونی تضادات کے حوالے سے یہ کہانی اسلامی معاشرے کے بعض قوانین پر بحث کے دروازے کھولتی ہے جس کی آڑ میں مرد اپنی خودغرض جبلت کا مظاہرہ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرنا چاہتے۔

کہانی کا مرکزی کردار ''آپا'' جو خوبصورت بھی تھیں اور ہوشیار بھی۔ اپنی محبت، محنت اور ہوشمندی کے سبب اپنے شوہر کی زندگی کو بھی بدل دیتی ہیں اور دنیا سے لے کر دین تک کی جدوجہد میں وہ اپنے شوہر کا بھرپور ساتھ دیتی ہیں۔ شوہر بھی انہیں دل و جان سے چاہتا ہے لیکن اولاد کی کمی کا احساس انہیں شدت سے رہتا ہے اور ایک دن جب ان کا شوہر ان سے اولاد کی خاطر شریعت کا حوالہ دیتے ہوئے دوسری شادی کی اجازت طلب کرتا ہے تو محبت اور عبادت کی ساری عمارتیں انہیں آن واحد میں زمیں بوس ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور وہ اجازت دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ یہاں کہانی کار نے ایک عورت کی سائیکی کو اس مہارت سے اجاگر کیا ہے کہ فلسفۂ حیات کے وضعی تمام افکار و نظریات اور مذہبی متعلقات بھی بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ کہانی کار نے آپا کے کردار کو بڑی ہنرمندی سے Paint کیا ہے۔

''کارٹون'' ایک نہایت عمدہ کہانی ہے۔ اس کے ٹریٹمنٹ میں کہانی کار نے اپنی ذہانت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ پوری کہانی خودکلامی کے انداز میں سامنے آتی ہے۔ یہ کہانی انسان کے دورخے پن اور دوہرے عمل کی ترجمانی کرتی ہے۔ کہانی کار نے دکھاوے کی عبادت کی مذمت کرتے ہوئے یہ اشارہ کیا ہے کہ آج انسان عبادت کو بھی اپنی مادی ضرورتوں کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔

کہانی کا ہیرو شجاع ایک ایسا شخص ہے جسے اپنی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ ایک کارٹون ناچتا ہوا نظر آتا ہے جو اس کی عبادت کے میکانکی انداز اور اس کے پیچھے چھپی ہوئی اس کی مفاد پرستی، ہوس اور خودغرضی کا پردہ فاش کر کے اس کا مذاق اڑاتا رہتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کی آواز سے تنگ آ کر اپنے باپ کے سامنے اپنی کوتاہیوں کا اقرار کرتے ہوئے کارٹون سے نجات پانے کی کوئی تدبیر جاننا چاہتا ہے لیکن اسے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا باپ بھی خود انہیں اوصاف کا حامل ہے تو وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور اپنے باپ کی شکل بھی اسے کارٹون سی نظر آنے لگتی ہے۔

یہ کہانی اس بات کا اشارہ ہے کہ عبادت انسانی زندگی کو تو نہیں بدل پاتی لیکن سماجی اور اخلاقی زوال خود عبادت کی شکلیں ضرور بدل دیتی ہیں۔

''سہاگ رات'' بھی ایک خوبصورت اور فکر انگیز کہانی ہے۔ یہ کہانی شریعت کے قوانین کی تفہیم اور انسانی فطرت کے بنیادی تقاضوں اور ضرورتوں کے درمیان اس ٹکراؤ کا اظہار ہے جس کے سبب اکثر انسانی زندگی قلبی عدم اطمینان اور ذہنی ناآسودگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ صورت حال انسانی زندگی میں حسن پیدا کرنے کے بجائے قبح پیدا کر دیتی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار تمام دوسری لڑکیوں کی طرح اپنی ازدواجی زندگی کا خواب دیکھتی آئی ہے اور مستقبل کے خوبصورت شہزادے کے حسین تصور میں کھوئی ہوئی سہاگ رات کی طرف بڑھتی ہے۔ لیکن سہاگ رات کا خوبصورت تصوراتی قلعہ اچانک اس وقت اس کے آنسوؤں کے سیلاب میں خس و خاشاک ہو جاتا ہے جب اس کے تصور کا شہزادہ بجائے اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنے اور اس کی سپردگی کو قبول کرنے کے اسے سنت کی پیروی کرتے ہوئے دو رکعت نماز پڑھنے اور روشنی گل کر دینے کی ہدایت دے کر خود اس لئے غسل کرنے چلا جاتا ہے کہ وہ اسے مباشرت سے پہلے مذہبی نقطۂ نظر سے واجب تصور کرتا ہے۔ یہ باتیں خود اس کے سپنوں کے شہزادے کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''محترمہ..... آپ دو رکعت نماز پڑھ لیجئے کہ سنت رسول ہے اور میں بھی غسل کر کے آتا ہوں کہ مباشرت سے پہلے واجب ہے اور..... ہاں، انہوں نے اک طائرانہ نظر سے روشنی کی طرف دیکھا اور کہا، ''یہ روشنی گل کر دو، یہ مکروہ ہے''۔ کچھ ہی دیر میں باتھ روم سے آنے والی پانی کے گرنے کی آوازیں اور اس کی آنکھوں سے بہتا ہوا کاجل، اسے مذاہب کے روحانی اور سماجی ملاپ سے پیدا ہونے والی سہاگ رات کا مطلب سمجھانے لگے''۔

(افسانہ ''سہاگ رات''، ص:۲۹)

یہ کہانی اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ انسانی نفسیات اور فطری جذبات کے تقاضوں کو کسی فلسفہ حیات یا مذہبی اصولوں کے ذریعہ پورا نہیں کیا جا سکتا۔

''یہ کیسی بے وفائی ہے'' کا موضوع بھی اچھوتا اور پر اثر ہے۔ یہ کہانی ہم جنس پرستوں کے غیر فطری رشتوں کے اس منفی اثرات پہ روشنی ڈالتی ہے جو مرد و زن کے درمیان فطری جنسی رشتوں پر خطرناک اور کاری ضرب لگاتے ہیں۔

کہانی اپنے مرکزی کردار عفت کی اپنے شوہر کے لئے حسن ظن اور اس کی مثالی شخصیت پر اعتماد کے گرد گھومتی ہے جسے ایک دن اس وقت زبردست جھٹکا لگتا ہے جب وہ اسے اس کے بچپن کے دوست شرافت بھائی کے ساتھ غیر فطری جنسی عمل میں مشغول دیکھ لیتی ہے۔ مردوں کے پرائی عورتوں کے ساتھ جسمانی تعلقات کے متعلق تو وہ جانتی تھی لیکن مردوں کے درمیان اس جنسی تعلق کو وہ بے وفائی کے کس خانے میں رکھے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس کہانی کا اختتام بالکل غیر متوقع ہے جو پڑھنے والے کو زبردست طریقے سے چونکاتا ہے۔

''بے زمینی نسل کشی ہے''، ہجرت کے پیچیدہ مسائل پر مبنی ایک عمدہ کہانی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جدید ترین مادّی وسائل اور سہولیات کی تلاش میں اپنی

پسماندہ سرزمین چھوڑ کر ترقی یافتہ ممالک کی طرف ہجرت کا عمل انسان کو بے زمینی اور بے وجودیت کے ایسے احساسات سے دوچار کر دیتا ہے جو صحت مند شخصیت کی تعمیر کے لئے انتہائی مضر ثابت ہوتا ہے اور نسل کشی کے مترادف بھی۔ ترقی اور خوشحالی کا حل بود و باش کے تبادلے میں نہیں بلکہ اس تاریخی عمل کے ساتھ مضبوط رشتے پر منحصر ہے جو وقت کے تقاضوں کے مطابق رونما ہوتا ہے۔ یعنی معاشی اور اقتصادی تبدیلیاں فرد کے لئے سماجی، تاریخی اور سیاسی تبدیلیوں سے گزرے بغیر ممکن نہیں۔

کہانی ایک ایسی عورت کے گرد بنی گئی ہے جو تیس سال قبل بہتر مستقبل کی تلاش میں اپنے ملک پاکستان کو خیر باد کہہ کر امریکہ آ بستی ہے۔ اب وہ صاحب اولاد بھی ہو چکی ہے لیکن اسے اپنا ملک ہر وقت یاد آتا رہتا ہے اور بے زمینی کا یہ احساس اسے انتہائی دکھی اور مایوس کر دیتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اس کے بچے اپنی نسلی پہچان کھو چکے ہیں۔ لیکن اسی درد کے احساس سے گزرتے ہوئے وہ اس حقیقت کا ادراک بھی کرتی ہے کہ نسلی تحفظ کا دارومدار جغرافیائی تبدیلیوں کے بجائے تاریخی تبدیلیوں سے اپنے رشتے کو مضبوط کرنے میں ہی مضمر ہے:

''وقت تو عفریت کا روپ دھار چکا تھا۔ جس کی زبان لمبی اور دانت خون آلود تھے۔ جس کا پھولا ہوا پیٹ تاریخ کے سارے گھناؤنے راز سمیٹے بے ہنگم انداز میں، آنے والی نسل انسانی کو پھر سے ڈکارنے تیار بیٹھا تھا۔ کتابوں کے ہر صفحے پر لفظ روتے تھے، دیومالائی کہانیاں ہوں یا آسمانی صحیفے، پیغمبروں کے قصے ہوں یا زمان و مکان کے جھگڑے، ہر لفظ آنسوؤں کی شکل بن بن کر بہتا تھا''۔ (افسانہ ''بے زمینی نسل کشی ہے''، ص:۳۳۔۳۴)

''ادھورا کافر'' بھی ایک دلچسپ کہانی ہے جو انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں پر سے پردہ ہٹاتی ہے۔ یہ دولت کے نشے میں سرشار، شراب و شباب کے رسیا ایک شخص جبران کی کہانی ہے جو نہایت پڑھا لکھا، ترقی پسند، آزاد خیال اور ذہین بھی ہے۔ پچیس سال کی عمر میں ایک نہایت حسین لڑکی نیلوفر سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ لیکن جلد ہی اسے محسوس ہوتا ہے کہ ذہنی معیار کے اعتبار سے نیلوفر اس کے لائق نہیں۔ وہ مستقل نئی نئی دوسری عورتوں میں دلچسپی لیتا رہتا ہے اور ایک دن وہ نیلوفر کو طلاق دے کر اسے اور اپنی دو سالہ بیٹی کو چھوڑ کر امریکہ چلا جاتا ہے جہاں کا ماحول اسے ذہنی سفر کے لئے بہت سازگار ثابت ہوتا ہے۔ اپنی ذہانت کے سبب وہ ترقی کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے اور ساتھ ہی جنسی تسکین کی آبیاری کے لئے بھی وہاں اسے بے شمار مواقع ملتے ہیں۔ لیکن آخر کار اسے محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام سہولیات، عیش و عشرت کے مواقع اور جنسی آسودگی کے باوجود ایک نامعلوم سا خلاء اور ذہنی ناآسودگی ہمیشہ اسے بے چین کئے رہتی ہے۔ یہ اس کی اس بیٹی کی کمی کا احساس ہے جسے وہ دو سال کی عمر میں چھوڑ آیا تھا۔ ایک اقتباس دیکھئے:

''جبران کو شاید پتہ تھا کہ مذہب علامتوں میں اترا تھا، اسی لئے اس نے ایمان کا وہ راستہ چنا جو کٹھن فکر کا تھا، ایسا راستہ جس کی منزلیں کبھی کبھی دبے منزل بھی کر دیتی ہیں۔ کچھ ہی سالوں میں اسے محسوس ہونے لگا کہ شاید اس کے مقدر میں بھی خدا کی طرح تنہائی ہے''۔ (افسانہ ''ادھورا کافر''، ص:۳۶)

''فورتھ ڈائمنشن'' بھی ایک قابل قدر کہانی ہے جس میں کہانی کار نے مطالعۂ کائنات کے توسط سے انسان اور خدا کو پیش کرنے کی کاوش کی ہے اور کہانی کے بنت میں بعض ایسے بلیغ اشارے کئے ہیں جو قاری کو غور و فکر پر مجبور کر دیتے ہیں:

''کہتے ہیں اس رات خدا اور انسان کا ملاپ ہوا تھا اور پھر اس روتے سسکتے ہوئے انسان کے شعور پر چوتھے ڈائمنشن کا دروازہ کھل گیا تھا جس سے نکلتی ہوئی روشنیاں کائنات کا سینہ شق کر گئی تھیں اور چند انمٹ سوالیہ نقوش چھوڑ گئی تھیں۔ خدا کی تخلیق خدا جیسی کیوں نہیں ہے''؟ (افسانہ ''فورتھ ڈائمنشن''، ص:۳۹)

بلند اقبال کی بعض ایسی کہانیاں ہیں جن میں انسان اپنے وجود کے ہونے پر کافی غور و فکر کرتے ہوئے خدا سے بھی مسلسل مکالمہ جاری رکھتا ہے۔ افسانہ ''خدا کا بت'' میں بھی کچھ اسی طرح کی عکاسی ہوئی ہے۔ یہ کہانی انسانی بے بسی اور محرومی کی اس انتہا کی علامت ہے جو خالق کائنات کی بے بسی کا بھی مذاق اڑاتی نظر آتی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار آزر ایک بت تراش ہے۔ اس کے بنائے ہوئے بت انسانی زندگی کی کربناک علامت بن کر سامنے آتے ہیں۔ ایک دن اس نے خدا کا بت بنانے کا فیصلہ کیا اور کافی غور و فکر کے بعد جب وہ خدا کا بت تراشتا ہے تو لوگ اس کے خلاف ہو جاتے ہیں اور اسے ان کے عتاب کا شکار ہونا پڑتا ہے:

''پھر یہ ہوا کہ آزر کے گھر کو آگ لگا دی گئی اور پھر اسے بھی زندہ جلا دیا گیا۔ آزر جلتا رہا اور لوگ تماشا دیکھتے رہے مگر کسی نے نہ دیکھا کہ اس کے راکھ ہوئے گھر میں ایک کچی مٹی کا بت بھی پک کر کندن ہو چکا ہے۔ آزر کا بنایا ہوا خدا کا بت۔ ایک چھوٹے سے معصوم بچے کا بت۔ جو لاغر، کمزور اور ننگا تھا، جس کے ہاتھوں پیروں کی ہڈیاں اور سینوں کی پسلیاں سوکھی ہوئی تھیں، جس کی بھوکی آنکھوں میں آنسو تھے اور جس کے ہاتھ میں خالی پیالہ تھا''۔ (افسانہ ''خدا کا بت''، ص:۴۱)

کہانی کار نے یہاں آزر جیسے تاریخی کردار کی بازدید کرتے ہوئے جو اشارے کئے ہیں، ان میں شکلیں ایسی ہی کیوں بنتی ہیں۔ یہ وہ علامتی سوال ہے جس میں ایک نئے قسم کے احساس کی کارفرمائی محسوس کی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ یہ بلند اقبال کی ایک شاہکار کہانی ہے۔

اپنے منفرد لب و لہجے اور اسلوب کے لحاظ سے ''بیوی دوسرے کی'' بھی ایک قابل توجہ کہانی ہے۔ کہانی کار نے اس میں نفسیاتی ٹریٹمنٹ سے خوب کام لیا ہے۔ انسانی فطرت کی گہرائیوں میں دبی ہوئی بعض خواہشیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے حصول کی کوششیں انسان کو مضحکہ خیز اور اس کے عمل کو ناپسندیدہ بنا دیتی ہیں۔ کچھ لوگوں کو دوسرے کی چیزیں اس قدر پرکشش معلوم ہوتی ہیں کہ وہ ان کے حصول میں دیوانے ہو جاتے ہیں اور اپنی دسترس کی نایاب چیزوں کو بھی کھو دیتے ہیں۔ زیر نظر کہانی کا مرکزی کردار عبدالجبار ایک ایسا ہی شخص ہے جسے دوسرے کی بیویاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ اور وہ کسی نہ کسی طریقے سے انہیں حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتا تھا۔ اکثر وہ اپنی اس کوشش میں

کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔

اس کی بیوی خود بھی نہایت حسین تھی لیکن وہ اس کے باوجود دوسرے کی بیویوں کے حصول میں مصروف رہتا تھا۔ بیوی کے لئے اس کی یہ حرکت جب نا قابل برداشت ہو گئی تو وہ بالآخر طلاق لے لیتی ہے۔ طلاق کے بعد وہ اور بھی زیادہ آزادی کے ساتھ اپنی اس عجیب وغریب جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔ ایک دن وہ ایک انجان شخص کی انتہائی خوبصورت سی نئی دلہن کو دیکھ کر پاگل ہو گیا اور اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اس کی طرف لپکتا ہے تو وہ اس کی سابقہ بیوی نکلتی ہے جسے اس نے طلاق دے دیا تھا۔ اس کہانی میں آج کی جدید کہانی کے تمام تر لوازمات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

''بے وفائی'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور یہ خواہش رکھتا تھا کہ مرنے کے بعد وہ اپنی بیوی جس کا انتقال سات سال قبل ہو چکا تھا، کی قبر کے بغل میں دفن ہو سکے۔ وہ سات سال سے روزانہ اس کی قبر پہ جاتا اور اس کی صفائی اور دیکھ بھال میں شرکت کیا کرتا تھا۔ ایک دن اپنی بیوی کی قبر کے بغل میں کسی اور شخص کی قبر کو دیکھ کر بے انتہا دکھی ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ اپنا وعدہ اپنی مردہ بیوی سے وفا نہیں کر سکے گا۔ اس کیفیت نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ اور وہ زار و قطار رونے لگتا ہے۔ تبھی قبرستان سے ملحق مسجد کے مولوی صاحب آ کر اسے بتاتے ہیں کہ زمین پر ملکیت کا فیصلہ صرف اللہ کے ہاتھ ہوتا ہے، کسی بندے کے نہیں۔

''انتظار'' بھی ایک عمدہ اور توانا کہانی ہے جس میں زندگی کے المیے کو خوبصورتی سے قابل قبول بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ زندگی کا تصور خواہ وہ خوبصورت ہو یا تکلیف دہ، انسان کے لئے ہمیشہ پر کشش ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں موت ایک انتہائی کرب ناک اور ناپسندیدہ شئے ہوتی ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں جب موت آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے۔

اس کہانی میں رونما ہونے والا ایک چھوٹا سا واقعہ اپنی تخلیقی وسعت کے سبب پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ کہانی کی مرکزی کردار میرین کار سے گزرتے ہوئے سڑک کے کنارے ایک سوکھے پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے ایک انتہائی ضعیف شخص کو دیکھ کر بہت غمزدہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس منظر کو دیکھ کر اسے اپنی موت بھی سامنے کھڑی محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ خود برین کینسر میں مبتلا تھی اور ڈاکٹر نے جب اسے یہ بتایا کہ اس کی زندگی کی مہلت صرف دو تین مہینے سے زیادہ نہیں تو وہ اس قدر آزردہ اور مایوس ہو جاتی ہے کہ واپسی کے سفر میں وہ اسی پیڑ کے نیچے جہاں اب اسے صرف وہ سوکھا پیڑ ہی ایستادہ نظر آ رہا تھا اور وہ بوڑھا غائب تھا۔ موت کے آنے والے کالے لمحے کے تصور میں بیٹھ کر رونے لگتی ہے۔ اس کہانی میں بلند اقبال کی فنکاری عروج پر نظر آتی ہے۔

اس مجموعے میں بعض اور بھی کہانیاں ایسی ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ''آدھا مرد''، ''پہلا پیار''، ''اندھا فرشتہ''، ''لفظ... جو طوائف بن گئے''، ''بھینٹ''، ''گدھ''، ''اکیسویں صدی کی موت''، ''شاہ دولہ کے چوہے'' اور ''میوٹیشن'' اپنے موضوعات کے لحاظ سے قابل لحاظ کہانیاں ہیں۔ ''پہلا پیار'' میں معاشرے میں جاری وساری سیاہ کاریوں پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ بلند اقبال نے اس کہانی میں بچوں پر جنسی زیادتی جیسے معاشرتی جرم کے پیچھے چھپے نفسیاتی المیے کو انوکھے زاویے سے پیش کیا ہے۔ ان کا جملہ ہے کہ ''ماسٹر شریف تو دو سال بعد اسکول چھوڑ گئے مگر رحیم داد کی روح کو عمر بھر ڈسنے کے لئے رینگتے سانپ چھوڑ گئے''۔ ''گدھ'' بھی لمحے بھر کی ایک طویل داستان ہے جسے پڑھ کر عصمت چغتائی کے ''لحاف'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ''میوٹیشن'' Sex Transformation پر مبنی ایک اچھوتی اور انوکھی کہانی ہے۔ اردو میں اس موضوع کو شاید ہی برتا گیا ہو۔ بلند اقبال نے اس میں مرد کی نفسیات، اس کی جنسی برتری کے المناک زوال اور اس کی نفسیاتی کم مائیگی کو اس ہنرمندی اور چابکدستی سے تخلیق کیا ہے کہ فنکاری کی داد نہ دینا یقیناً بے انصافی ہوگی۔ ''لفظ... جو طوائف بن گئے'' میں بھی ایک اہم نکتہ پیش کیا گیا ہے۔ اب قلم کاروں کے لئے لفظ بے قدرے ہو چکے ہیں اور لفظوں کا کردار طوائف سے مختلف نہیں رہا۔ اس کہانی میں آج کے تخلیق کاروں کی بے بسی کی آئینہ داری کی گئی ہے اور یہ بتانے کی کاوش کی گئی ہے کہ وہ بوجوہ اپنے لفظوں کو اپنی مرضی کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ کہانی کا اختتام کافی چونکانے اور پریشان کرنے والا ہے۔ چند جملوں میں جا بجا بکھری ہوئی طنزیہ کاٹ اور تخلیق کار کے کرب کو آپ بھی محسوس کیجئے:

> ''اور جب وہ جوان ہوئی تو کافی عرصے تک خود کو آئینے میں ڈھونڈتی رہی... کوئی چاند چہرہ، کوئی ستارہ آنکھیں، کوئی سرو قد، کوئی چمپئی رنگت، کوئی جو مسکرائے تو دیکھنے والی آنکھوں میں نشہ سا چھا جائے، کوئی جو اٹھلائے تو جاتی ہوئی بہار کے بھی قدم ڈگمگا جائیں... آہ! مگر ایسا تو کوئی بھی آئینے میں نہیں تھا... بس ایک چیچک زدہ سا چہرہ اور دو بجھتے ہوئے دیئے جیسی آنکھیں... پھر ایک دن تھک ہار کر وہ کتابوں میں کھو گئی۔ کتابیں جو اس کے اندر کی سچائی کو باہر کی بدنمائی سے ملا کر اسے خوبصورت بنا دیں۔ کتابیں جو بدنما لفظوں کے آئینے سے نکال کر اسے خوبصورت معنوں کی دنیا میں پہنچا دیں... مگر لفظ بھیانک تھے... وہ کسی کے نازک لبوں اور لچکتی کمر کی تعریفوں میں بسے ہوئے تھے۔ وہ کسی دہکتے گالوں اور سنہری زلفوں کے تاروں میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ حسن اور عشق کی بارگاہ میں کسی طوائف کی طرح ناچ رہے تھے۔... اس نے ساری کتابیں آگ کی نذر کر دیں اور... ان ادیبوں کی تلاش میں نکلی... دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کی آنکھیں حیرانی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں... وہ تخلیق کار تو اس سے بھی زیادہ بدصورت تھا۔... اس نے روتے ہوئے پوچھا... کیوں؟ ایک لفظ بھی ان کتابوں میں تمہارے بارے میں نہیں... آخر کیوں؟
> بدصورت تخلیق کار نے اسے مسکرا کر دیکھا اور کہا... تم نے کتابیں تو پڑھ لیں مگر شاید ٹائٹل نہیں پڑھا... لفظ... جو طوائف بن گئے''۔

(افسانہ ''لفظ... جو طوائف بن گئے''، ص: ۹۷)

غرض کہ بلند اقبال کو کہانی کہنے کا فن آتا ہے۔ وہ اس کے فن اور تکنیک سے واقف ہیں۔ ان کی فکر رسا اور بلند ہے۔ اسی لئے ان کی کہانیاں ترقی یافتہ دنیا اور اس کے فعال معاشرے کے ظاہر و باطن کو پوری طرح آشکار کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کی بنت اور موضوعات میں تنوع ہے جو ان کے معاصرین سے قدرے مختلف اور پر اثر ہیں اور یہ بلاشبہ قارئین کی بصیرت و بصارت پر فکر کے انگنت در وا کر دیتے ہیں۔ ان کا اسلوب بھی ان کی انفرادیت کا ضامن ہے۔ اس میں بلا کی ندرت، دلکشی اور محاورے کی چاشنی موجود ہے۔ زبان شستہ ہے۔ راست و پیچیدہ بیانیہ دونوں قسم کی مثالیں ان کے یہاں ملتی ہیں۔ ان کی کہانیاں مختصر اور جامع ہوتی ہیں جو قاری کے ذہن پر گہرے ارتسامات ثبت کرتی ہیں۔

بلند اقبال ابھی اپنی افسانہ نگاری کے آغاز سفر میں ہیں۔ ان کے نقش اوّل نے ہی جو تخلیقی جوت جگائی ہے اور جس طرح کا بیانیہ خلق کیا ہے وہ یقیناً ان کے آگے اور بہت آگے جانے کی بشارت دیتا ہے۔ میں ان کی ذات سے اردو فکشن کی بہترین خدمات کی توقع رکھتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اردو فکشن میں ان کا اقبال یقیناً بلند ہوگا۔

☆☆

Dr. Humayun Ashraf
Associate Professor
P.G.Department Of Urdu
Vinoba Bhave University
Hazaribagh (Jharkhand)
Mobile:- 09771010715
Email :- dr.h.ashraf@gmail.com